اسلامی علوم میں سب مقدم جوعلم تھا وہ علم حدیث تھا۔ جس تحقیق کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر اسکی تدوین کی جاتی تھی ۔اسلام کے اصول کے تحقیق کو دو طرح سے پیش کیا جاتا ہے ۔ایک اصول روایت کا ہے ،یعنی روایات کو اسطرح چھانا پھٹکا جائے کہ حقیقت معلوم ہو جائے ۔دوسرا اصول درایت کا ہے یعنی پرکھ پڑچول کا طریقہ۔ یہ طریقہ سخت تنقید اور جرح کے اصولوں کا حامل ہے۔ اس میں روایت کو عقلی حیثیت سے پرکھا جاتا ہے۔ اور جو روایت عقلی اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو اسے رڈ کر دیا جاتا ہے، علم حدیث میں روایت کو درایت کے اصولوں پر پرکھا گیا۔

تحقیق میں تلاش اور تفتیش اس کے مترادفات ہیں مگر جب تحقیقی میدان کی بات کریں تو تلاش و تفتیش اس کے ذیلی قرار پاتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد محض صداقت کی تلاش اور حقائق کی تفتیش یا بازیافت نہیں بلکہ یہ ایک منظّم، مدل اور معروضی طور پر کرنے والا کام ہے ۔تحقیق بعض مفروضات کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے فرضیات کے حقایق دریافت کرنے میں مدد دیتی ہے ۔یعنی تحقیق ایک ایسا طریق کار ہے جو منظّم، معروضی اور مدلل طور پر انجام پاتا ہے ۔ یعنی صداقت کو موضوعی طور پر ایک شخص کے جاننے سے یہ انسانی معاشرے میں نہیں پہنچائی جاسکتی ، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے بھی اسی کی مانند اُسکو جان لیں اور اسکا یقین کر لیں ۔تحقیق ،تلاش اور تصدیق ایک باضابطہ طریق کار کے مطابق انجام پاتی ہے۔ یہ طریق کار سائنسی، منطقی اور معروضی ہوتا ہے یعنی تحقیق غیر جانبداری سے انجام دیا جانے والا عمل ہے جس میں ذاتی رائے اور پسند و ناپسند کا دخل نہیں ہوتا۔ اسلام میں اسے عدل ،اور تکنیک میں اسے معروضیت کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلامی تحقیق میں خصوصاً فنِ حدیث میں یا احادیث کو مرتب کرتے وقت بہت عرق ریزی سے کام لیا گیا۔ کسی کے قول کو من عن قبول نہ کیا گیا جب تک کہ کہنے والے شخص کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہ کر لی گئیں اور اُسکی عادات و خصائل اور عقلی حالت پر تحقیق نہ کر لی گئی۔ اس کے علاوہ احادیث کی کڑی سے کڑی ملائی گئی کہ کس نے

کس سے سنکر کس کو بتایا۔فن حدیث کے ساتھ فن سیرت کے سلسلے میں بھی یہی اصول اپنائے گئے۔اسلام میں تحقیق، اسلام اور رسول اللہؐ کے حوالے سے ہی شروع ہوتی تھی۔ بعدازاں یہ طریق کار دوسرے علوم پر بھی استعمال کیا گیا۔ جیسے فن تاریخ میں،یعنی تاریخ نویسی کے وقت۔

اسلامی تحقیق کے حوالے سے تاریخ نویسی کے بارے میں ابن خدون کے مطابق یہ فن ہمیں گزشتہ اقوام کے اخلاق واحوال بتاتا ہے،انبیاء کی سیرتوں پر آگاہ کرتا ہے۔حکومتوں اور سیاست میں سلاطین کے حالات کی خبر کرتا ہے تاکہ اگر کوئی کسی دینی یا دینوی سلسلے میں ان میں سے کسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہے تو اُسے پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔اس سلسلے میں تحقیق کے لئے متعدد ماخذوں کی،انواع علوم ومعارف کی،حسن نظر کی اور اصابت رائے کی ضرورت ہے تاکہ گہرا فکر اور اصابت رائے مطالعہ کرنے والے پر حق کو کھول دیں اور وہ حق کی روشنی میں لغزشوں اور غلطیوں سے محفوظ رہے۔کیونکہ اگر تحقیق میں محض نقل پر اعتماد کرلیا جائے اور اصول عادت،قواعد سیاست، مدنیت کی طبعیت اور معاشرے کے حالات کو گواہ نہ بنایا جائے اور موجود کا غیر موجود پر اور غائب کا حاضر پر قیاس نہ کیا جائے تو ان میں بہت سی لغزشوں اور غلطیوں اور راہ راست سے ہٹ جانے کا امکان باقی رہتا ہے۔چنانچہ محققین سے بہت سی غلطیاں محض اس لئے پیش آئیں کہ اُنھوں نے صرف نقل پر خواہ غلط ہو یا صحیح،قناعت کرلی اور واقعات کو ان کے اصول ومعیار پر کس کر نہیں دیکھا اور اشباہ ونظائر پر قیاس نہیں کیا نہ اُنہیں حکمت وفلسفہ کی کسوٹی پر کسا اور نہ کائنات کی طبیعتوں پر پرکھا اور نہ ان پر نظر وبصیرت کی گواہی مانگی ۱۔

تحقیق کی سائنسی ومعروضی بنیاد:۔

سائنس ایک طریق کار ہے جو حقیقت کی جستجو کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور جس پر تمام دنیا کے سائنس دان عمل پیرا ہیں۔سائنس کا مقصد کسی چیز کو سمجھنا ہے۔سمجھنے کے لئے بیان تشریح اور پیش گوئی کا ہونا لازمی ہے۔

سائنس کے تین بنیادی مفروضے ہیں۔اوّل یہ کہ کائنات میں ایک نظم وضبط موجود ہے، دوسرے یہ کہ انسانی ذہن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اس نظم وضبط کے اصولوں کو سمجھ سکے۔تیسرے یہ کہ کائنات ایک معروضی حقیقت ہے اور انسان اسکا اہم جزو ہے اور اس پر کنٹرول پاسکتا ہے اور اسی لحاظ سے پیش گوئی کرسکتا ہے۔سائنسی طریقہ کار کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ سائنس ایک بامقصد علم ہے۔یہ تجرباتی اور منطقی ہے،اسکا تعلق اصولوں اور قاعدوں سے ہے۔یہ تجربے قابل تکرار ہیں،اور سائنس ایک خود اصلاحی عمل ہے۔

سائنسی طریقے سے کی گئی تحقیق کا نتیجہ جلد حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے برسوں کی محنت درکار ہے۔ تحقیق کے عمل میں سب سے پہلے مشاہدے کو اہمیت حاصل ہے۔دوسرے اسباب کی تلاش اور پھر نتیجے کے طور پر ان اسباب کو بنیاد بنا کر اپنا لائحہ عمل تیار کرنا ہے تاکہ اُن واقعات کو قابو میں لایا جاسکے جو انسان کے اردگرد ظہور پذیر ہوتے ہیں۔روزمرہ زندگی میں سائنس کے استعمال سے واقعات کے اسباب کی نئی نئی پرتیں سامنے آتی ہیں یعنی واقعات کے اسباب تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور سائنس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے جس کی بنا پر انسان پیش گوئی بھی کرتا ہے اور حالات کو کنٹرول کرنے کی تدبیر بھی کرتا ہے،لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کا علم ایک متواتر جدوجہد ہے، نیز سائنس کی بنیاد منطق اور مشاہدے پر مبنی ہے۔

غیر سائنسی اور غیر معروضی تحقیق کی مثال دیتے ہوئے ابن خلدون نے مسعودی اور دیگر مورخین کی مثال دی ہے کہ اُنھوں نے حضرت موسیٰ کی فوج کی تعداد چھ لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی۔لیکن اگر علاقہ مصر و شام کا اندازہ لگایا جائے تو بیس برس سے اوپر کے نوجوان جو فوج میں شامل تھے،اتنی فوج ان ممالک سے نہیں بن سکتی تھی ،کیونکہ ہر ملک کے لئے فوج کی اتنی ہی تعداد رکھی جاسکتی ہے جس تعداد کی اس میں گنجائش ہو اور وہ ان کے مصارف بھی سہار سکے اور اس سے زیادہ تعداد کی صورت میں فوجیں جن میں ایک کی تعداد بہت کم ہو ایک دوسرے سے کیسے لڑسکتی

ہیں۔ کیونکہ وہ جب ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکیں گی تو لڑیں گی کیسے۔ جب منتہائے نگاہ سے دگنا یا تگنا فاصلہ ہو تو لڑائی ممکن نہیں۔

ابن خلدون کے مطابق حال ماضی کی نشاندہی کرتا ہے ماضی حال سے ہو بہو مشابہ ہے، یہ بھی کسی بات کو جانچنے کا ایک سائنسی اور معروضی طریقہ ہے۔ جس طرح شاہ فارس اسرائیل کے بادشاہ سے بہت بڑا تھا اور اسکی حکومت اسرائیلی حکومت سے بہت وسیع تھی۔ بخت النصر کی حدود میں عراقین، خراسان اور ماوراالنہر بھی شامل تھے، مگر پھر بھی اسکی فوج کی تعداد اتنی نہ ہوتی جتنی کہ اسرائیلی فوج کی بتائی گئی۔ چنانچہ ہمیں اپنے حال سے ماضی کا قیاس لگانا چاہیئے، اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ کوئی بات کسی دور میں ممکن تھی بھی یا نہیں، کسی بات کو ماننے سے پہلے اس پر مدلل جرح اور دلائل و براہین سے اسکو ثابت کرنا تحقیق کا سب سے بڑا اصول ہے۔

تحقیق نہایت غیر جانبداری سے انجام دیا جانے والا عمل ہے جس میں ذاتی رائے اور پسند ناپسند کو دخل حاصل نہیں۔ اسلام میں اسے ''عدل'' اور تکنیک میں اسے ''معروضیت'' کا نام دیا گیا ہے۔ تجرباتی تحقیق میں تو معروضیت یا غیر جانبداری رکھنا آسان ہے مگر دستاویزی تحقیق میں معروضیت کی تلاش اور اطلاق بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ کیونکہ ادبی فن پارے کا حسن یا زبان دان اور ادیب کی سماجی حیثیت، رجحانات اور حدود ان نازک سی معنوی تعبیرات میں موجود ہوتے ہیں، جنہیں معروضی گرفت میں لانا مشکل ہوتا ہے، فنی کیفیات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا، محض تنقیدی اصول برت کر جو اکثر خود معروضی نہیں ہوتے معروضی نتیجہ نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔

معروضیت نے تحقیق کے سلسلے میں کچھ پیمانے بنائے ہیں۔

۱۔ جب تک کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو تحقیق نہیں ہو سکتی۔

۲۔ جب تک اس مسئلے کا حل نظر نہ آرہا ہو تحقیق نہیں ہو سکتی۔

۳۔ جب تک یہ ممکنہ حل فریضوں کے طور پر جانچے نہ جائیں تحقیق نہیں ہوسکتی۔

۴۔ جب تک تحقیقی نتائج بار بار تحقیق کرنے سے ایک جیسے نہ آئیں تحقیق مکمل نہیں ہوسکتی۔

۵۔ جب تک یہ نتائج صحت، جواز اور وثوق کے لحاظ سے معتبر نہ ہوں تحقیق قبول نہیں ہوسکتی۔

معروضیت میں کوائف کا یا معلومات کا درست ہونا صحت کہلاتا ہے۔ کوائف اپنے متن، معیار، عصر، تصورات وغیرہ کے لحاظ سے جائز اور موزوں ہوں تو اسے جواز کہا جاتا ہے اور کوائف اپنے نتائج کے اعتبار سے بار بار ایک سے ہوں تو اسے وثوق یا اعتباریت کہا جاتا ہے۔ لسانی اور ادبی تحقیق میں معروضیت قائم کرنے کے لئے ہر قدم پر 'عدل' کی شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے، معروضیت کے بغیر کوئی تحقیق، تحقیق نہیں کہلاسکتی۔ تحقیق کار کیلئے اعتبار، اعتماد، موزونیت، وثوق، جواز، صحت، معروضیت کے پیمانے ہیں۔ وہ نہ کوائف اور معلومات کو بگاڑتا ہے نہ بدلتا ہے اور ہر کوئی اُس کے نتائج کی پڑتال کرسکتا ہے۔

مسلمانوں کا سائنسی ومعروضی طریق تحقیق:۔

یقین کے ارتقائی پیمانے میں علم کے تین درجے ہیں۔

ا۔ علم بذریعہ استنباط یعنی منطقی استدلال

۲۔ علم بذریعہ مشاہدہ یعنی روزمرہ امور

۳۔ علم بذریعہ تجربہ یعنی شواہد کو محدود کرکے پرکھنا، دہرانا اور نتیجہ نکالنا۔

مسلمانوں کے ہاں اسی سے سائنسی طریق تحقیق نے جنم لیا۔ جس میں روایت، درایت، مشاہدہ اور تجربہ کو بنیاد بنایا گیا اور منطقی، استخراجی سے استقرائی کی طرف سفر کے بعد طریق تحقیق منضبط ہوتے۔ سائنسی طریقہ کا آغاز الکندی اور جابر بن حیان جیسے سائنسدانوں سے ہوا۔ ابن سینا نے اس طریق کار کو باقاعدہ منظم کیا اور علم قیاس کو

استقرائی علم سے ہم آہنگ کیا۔ابوالبرکات البغدادی نے فریضے کو ثابت کرنے کے لئے اسکی طبعی علت معلوم کرنے کا طریق وضع کیا۔اس کے بعد ابو بکر الرازی نے آزمائش اور جانچ یعنی ٹسٹ کا طریقہ اپنایا جسے عملی طور پر البیرونی نے استعمال کیا۔البیرونی کا طریقہ کار جدید سائنسی تحقیق کی مانند تھا۔اسکی کتاب ''قانون المسعودی'' ایسے طریقوں کی مثالوں سے پُر ہے۔

تحقیق میں ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر معروضی طریق،صورتیں اپنانا بہت ضروری ہیں۔مسلمانوں کے لئے معروضی تحقیق کے لئے چند اصول ضروری ہیں جن کے ذریعے اسلامی موضوعات پر تحقیق کا لائحہ عمل مرتب ہو سکتا ہے۔

۱۔چند مسلمات پر ایمان اور نفس قرآنی کا فہم

۲۔معلومات اور روایات کی جمع آوری

۳۔فریضوں کی تشکیل

۴۔فریضوں کی روشنی میں روایات یا معلومات کی جانچ پرکھ

۵۔مشاہدات اور تجربات کے نتائج

۶۔اصولِ عدل سے کام لیتے ہوئے معروضی نتائج

اسلامی تاریخ کے سماجی عمل میں یہ کام فقیہہ سرانجام دیتے ہیں۔اس سلسلے میں فقیہہ پر ہی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ فتویٰ دیتے وقت بھی ایسے ہی معروضی اصولوں کو پیش نظر رکھے جن سے روح اسلام مجروح نہ ہو اور عدل کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔اصول تحقیق کی تاریخ میں مسلمانوں کا یہ کردار جدید تحقیقی منصوبوں کی طرف انہیں راغب کرنے کے لئے اساس کا کام دیتا ہے۔اپنے تحقیقی کاموں میں مسلمانوں نے بعض نکات کو مسلمات قرار دیا۔جدید

طریق تحقیق میں آج بھی ہم اس اقدام کو مسلمات یا مفروضیات قرار دیتے ہیں۔اور انھیں بنیادی طور پر تسلیم کر کے آگے چلتے ہیں۔یہی اسلامی تحقیقی روایت ہے اور جدید تحقیق کے اصولوں کا پہلا مرحلہ قرار پاتا ہے۔

فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، اُن میں سب سے قوی حکومت کا اثر ہوتا ہے۔لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر رہا کہ اُن کا قلم تلوار سے سرنگوں نہ ہوا، حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانے میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے اشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد و جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور مجمع میں سر منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثوں کو امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوایا، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشن گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانے میں محدثین نے اعلانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روائتیں ہیں۔آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے اور بنوامیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اسی مقام پر ہیں جہاں انہیں ہونا چاہئے تھا۔

ایک دفعہ مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا گیا کہ امیر المومنین !اگر تو آنحضرتؐ کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے پیدا نہ ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیت کر لیتے۔وہیں سر دربار ایک شخص نے اُٹھ کر کہا تو جھوٹ بولتا ہے، امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ) وہاں موجود تھے۔اُنہیں کس نے پوچھا، مومون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔یہ تاریخ میں معروضیت کی ایک مثال ہے جس پر چل کر مسلمانوں نے تحقیق کا کام سرانجام دیا۔

صحت ماخذ:۔

سیرت نبویؐ اور احادیث ،نبوت کے کافی عرصے (دور بنوامیہ) بعد قلمبند ہوئیں۔اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی بلکہ اکثر زبانی روائتیں تھیں۔اس قسم کا موقع جب بھی کسی قوم میں پیش آتا ہے تو ہر طرح کی

افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ان واقعات میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔لیکن مسلمانوں نے جو فن حدیث وسیرت کا معیار قائم کیا وہ اس سے بہت بلند تھا جیسا کہ قدیم تاریخ یورپ سے تاریخی تصنیفات میں رکھا گیا۔اُس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اُس شخص کی زبان سے کیا جائے جو خود شریک واقعہ ہو۔اگر خود شریک واقعہ نہ ہو تو تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔[۲]

اصول روایت:۔

راوی کے بارے میں یہ باتیں مدِ نظر رکھی جاتی تھیں کہ جو شخص روایت کر رہا ہے یا اگر روایت سلسلہ وار ہے تو وہ کون لوگ تھے جو راوی تھے، اُن کے مشاغل کیا تھے، چال چلن کیا تھا اور حافظہ کیسا تھا۔اُنکی سمجھ کیسی تھی ثقہ تھے یا غیر ثقہ، وہ سطحی ذہن رکھتے تھے یا دقیق نظر رکھتے تھے۔پڑھے لکھے تھے یا جاہل تھے۔مثال کے طور پر اگر ہم امام بخاریؒ کی احادیث کو لیں تو وہ ہر دو سطروں کے بیان کے بعد تین سے لیکر نو حوالوں تک بیان کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے یہ کہا اور ہر نسل میں اس کی روایت کرنے والے موجود ہیں۔پھر صرف امام بخاریؒ ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا، امام بخاریؒ سے لے کر رسول اکرمؐ تک جن محدثین نے حدیث کی روایت کی ہے ان کی کتابیں موجود ہیں۔جسے امام بخاریؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے حدیث بیان کی، اُنھوں نے عبدالرزاق بن سیمام سے روایت کی جنھوں نے اپنے استاد معمر سے روایت کی، معمر نئے کہا کہ مجھے میرے اُستاد سیمام بن منبہ نے ابو ہریرہؓ سے سن کر بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے یہ کہا ہے۔ اگر یہ تمام کتابیں کڑی در کڑی ہمیں ملتی جائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی حدیث درست ہے۔کیونکہ تمام ماخذوں میں یہ حدیث موجود ہے۔پھر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنکی تصدیق دوسرے ذرائع سے ہوتی ہے۔مثلاً ایک دوسرے سلسلۂ اسناد سے امام ترمذی نے وہی حدیث بیان کی ہو تو ہمیں اسکی سند ماننے میں عذر نہیں ہوسکتا۔چنانچہ یہ

ماخذوں کو جانچنے کے تکنیکی طریقے ہیں۔[۳]

اولین دور اسلام میں ان جزوئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل تھا کہ سینکڑوں ہزاروں حدیثوں میں سے چھانٹ کر صحیح حدیثوں کا باہر لانا۔ محدثین نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے۔ راویوں سے ملے، اُن کے متعلق ہر طرح کی معلومات حاصل کیں۔ جو لوگ اُس زمانے میں موجود نہ تھے اُن سے ملنے والوں سے حالات دریافت کیے اُن لوگوں کے بارے میں معلومات کے خزانے سے اسماء الرجال (سوانح نگاری) کا عظیم الشان فن تیار ہو گیا جو کہ نہایت عرق ریزی اور تحقیق کا نتیجہ تھا۔

روایت کے سلسلے میں مالکیؒ، شافعیؒ اور حنبلیؒ علمائے اصول کی رائے میں ہر وہ خبر جو متاوتر کی تمام شرائط یا کوئی ایک شرط پوری نہ کرے خبر واحد کہلاتی ہے۔ ابوالحسن ماوردی نے اسکی تعریف اس انداز میں کی ہے کہ خبر واحد وہ خبر ہے جو اتنی قلیل تعداد سے مروی ہو کہ اُس کا مخفی طور پر جھوٹ، غلطی یا بھول پر اتفاق کر لینے کا گمان جائز ہو۔ یعنی جو خبر متواتر کی تعریف کے برعکس ہو۔ کیونکہ خبر متواتر میں غلطی، سہو یا جھوٹ پر اتفاق محال ہوتا ہے۔ یعنی ایسی خبر جس کے سچے یا جھوٹے ہونے کے بارے میں معلوم نہ ہو خبر واحد ہے۔ علمائے اصول نے خبر واحد میں راویوں کے جھوٹ پر متفق ہونے کے امکان اور سہو و نسیان کے احتمال کو ختم کرنے کے لئے اس کے راوی اور نفس خبر میں کچھ ایسی شرائط عائد کی ہیں جنکی وجہ سے وہ خبر موجب عمل بن جاتی ہیں یعنی راوی کے چار شرائط ہیں۔

۱۔اسلام ۲۔عدالت ۳۔ضبط ۴۔عقل[۴]۔

اصول درایت:۔

اصول درایت دراصل قرآن مجید کا قائم کردہ ہے۔ جب حضرت عائشہ پر منافقین نے تہمت لگائی تو بعض صحابہؓ تک مغالطے میں آ گئے۔ قرآن مجید کی جو آئتیں حضرت عائشہؓ کی برات اور طہارت کے متعلق نازل ہوئیں ان

میں سے ایک یہ ہیں۔

ترجمہ:۔ اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات

بولنا مناسب نہیں۔ سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے (نور۔۲)

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جو واقعہ خلاف قیاس ہو اُسے غلط سمجھنا چاہئے۔ عام تحقیق کے اصول کے مطابق تو اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الرواتیہ ہیں یا نہیں پھر اُن کی شہادت لی جاتی مگر خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ تم نے سننے کے ساتھ ہی اسکو بہتان کیوں نہیں قرار دیا۔

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

''ابن جوزی نے کہا کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے۔ اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات و مشاہدہ کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو۔ یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو، یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جاتی ہو۔ بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے ۔ یہ تمام اصول درایت سے متعلق ہیں۔ کبھی یہ راوی سے متعلق ہیں۔ جب راوی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے

روایت کرتا ہے اس سے ملا تک نہ ہو۔ یا وہ حدیث جسکو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضروری تھا۔ یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہو اگر وہ واقعہ ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اسکو بیان کرتے۔[۵]

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے خلاف ہو

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو

۴۔ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو

۶۔ معمولی کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی یا لغو ہو

۸۔ جو راوی کسی ایسے شخص سے روایت کرتا ہو جس سے وہ ملا نہ ہو اور کسی اور نے بھی وہ روایت نہ کی ہو۔

۹۔ روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو با ایں ہمہ کو ایک راوی کے سوا کسی اور نے اسکی روایت نہ کی ہو۔

۱۰۔ جس روایت میں ایسا قابل اعتماد واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر سچ ہوتا تو سینکڑوں افراد اسکی گواہی دیتے۔[۶]

ان اصولوں سے محدثین نے کام لیا اور اُن کی بنا پر بہت سی رواتیں رد کردیں۔مثلاً اگر کہا جائے کہ کسی شہر میں یہ بات ہوئی۔مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ وہ شہر اس دور میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔تو ہم اسے غلط سمجھیں گے۔یہ جھوٹ بھی ہوسکتا ہے سہو بھی اور غلطی کاتب بھی۔پھر احادیث میں بعض اوقات اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔اُس سلسلے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے ایک بات سے منع کیا گیا ہو اور بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی ہو۔یعنی ایک حکم قدیم ہو اور دوسرا حکم جدید۔یا ایک خاص حکم ہو اور دوسرا عام حکم ہو۔چنانچہ اس اصول درایت کے تحت کام کرنے والے محدثین کے لئے لازم تھا وہ عالم ہوں، ذہین ہوں اور تمام تاریخ پر اُن کی نظر ہوتا کہ وہ مختلف واقعات کو عقل وقیاس کی کسوٹی پر پرکھ سکیں۔مگر یہ محض عقل ہی نہیں ہوتی بلکہ عقل کو علم وتجربے سے حاصل شدہ ملکہ کے لئے استعمال کرکے بصیرت حاصل کرتے ہیں۔اس لئے محض عقلی تنقید درایت نہیں ہوتی۔

ان اصولوں پر عمل پیرا ہوکر محدثین نے قرآن مجید کے ساتھ احادیث کو بھی اہمیت دی اور سنت کو بھی۔کیونکہ قرآن میں مذکور ہے کہ جو شخص رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا خدا کی اطاعت کرتا ہے۔حدیث سے متعلق تین چیزیں پائی جاتی ہیں ایک رسول اللہؐ کا قول، دوسرا رسول اللہؐ کا فعل، اور تیسرا رسول اللہؐ کا کسی دوسرے کے قول وفعل کو برقرار رکھنا یعنی اصلاحی طور پر رسول اللہؐ کی تقریر۔حدیث کے معنی بولنا، اور سنت کے معنی طرز عمل کے ہیں، بارہا صحابہؓ کی نقل کردہ روایت میں رسول اللہؐ کا قول ہوتا ہے اور رسول اللہؐ کا عمل بھی۔مگر اسطرح حدیث اور سنت کو الگ الگ جمع کرنا ناممکن بات تھی اس لیے کثرت استعمال سے حدیث سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔

جس حدیث میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ کہتا ہے اسے حدیث قدسی کہتے ہیں۔اگر رسول اللہؐ اپنے الفاظ میں کہیں تو اسکی دو قسمیں ہیں ایک سرکاری مراسلے اور دوسرے صحابہ اکرام کا اپنے طور پر رسول اللہؐ کے قول وفعل کا جمع کرنا۔

حدیث لکھنے میں سب سے اہم حضرت انس بن مالکؓ ہیں ۔ہجرت کے وقت اُن کی عمر دس برس تھی ۔ جب رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ اُنھیں رسول اللہ کی خدمت میں لائیں اور کہا کہ میرا بچہ لکھنا پڑھنا جانتا ہے اس لئے آپ اسکو اپنی غلامی میں لے لیں ۔ چنانچہ آپ رسول اللہؐ کے ساتھ اُنکی وفات تک رہے اور آپ کی ظاہری و باطنی زندگی کا مشاہدہ کرتے رہے ۔آپؐ کی وفات کے بعد جب مسلمان حضرت مالکؓ سے اُن کے حالات دریافت کرتے تو وہ ایک پُرانا رجسٹر نکال کر بتاتے کہ یہ باتیں جو انھوں نے لکھی ہیں وقتاً فوقتاً رسول اللہؐ کو دکھاتے بھی رہتے تھے ۔ یہ حدیث کی صحیح ترین کتاب ہے ۔

اسلامی اصول تحقیق :۔

مسلمانوں نے اپنے عہدِ زریں میں اصول روایت اور اصول درایت دونوں پر عمل کیا، اسکا آغاز تدوین قرآن سے اور انتہائی سائنسی طریق کار کے مطابق ہوا ۔یعنی کسی تحقیقی تصنیف سے پہلے تدوین کا کام شروع ہوا۔

تدوین قرآن :۔

حضرت محمدؐ کے وصال کے وقت قرآن مجید دو صورتوں میں موجود تھا، اوّل صورت قرآن کے حافظوں کے ذہنوں میں تھی اور اور دوئم صورت مختلف کاغذوں ، چمڑوں ، ہڈیوں اور پارچوں پر رقم تھی ، انہیں یک جا کرنا اور ایک معیاری نسخہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا ، یہاں اصول تقابل کام میں لایا گیا یعنی متن کی تدوین مختلف روائتوں اور ماخذوں کے تقابل سے کی گئی اور معیار و مسلمات کے لئے قریش کے عربی لہجے کو استعمال کیا گیا ، اس سلسلے میں محقق اعلیٰ زید بن حارثؓ تھے ۔

الفہرست کے مطابق محمد بن اسحاق کا کہنا ہے کہ ہم سے ابوالحسن محمد بن یوسف ناقط نے اس سے یحییٰ بن محمد ابوالقاسم نے ، اس سے سلیمان بن داؤد ہاشمی نے ، اس سے ابراہیم بن سعد نے ، زہری کی روایت سے اور زہری نے

عبید بن سلف سے روایت کیا کہ مجھ کو زید بن ثابت نے بتایا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجھے بلا بھیجا، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں حضرت عمر بن خطاب بھی تشریف فرما تھے۔مجھ سے حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یمامہ کے معرکہ میں قُرآئے قرآن کثرت سے قتل ہوئے ہیں۔ مجھے یہ اندیشہ ہو گیا ہے کہ اگر ہر جگہ قُرآئے قرآن کو اسی طرح نیست و نابود کر دیا گیا تو قرآن کا بیشتر حصہ ضائع ہو جائے گا اس بناء پر میری خواہش ہے کہ اسوقت جمع قرآن کا اہتمام کرلیا جائے۔[۸]

چنانچہ حضرت زیدؓ کے سامنے تمام ماخذ لائے جاتے۔وہ خود بھی حافظ قرآن تھے۔لیکن اس کے باوجود کم سے کم دو ماخذوں کا تقابل ضروری تھا۔چنانچہ جو آیت دو تحریری ماخذوں میں ملتی اُسے نقل کرلیا جاتا۔یہ عمل حضرت ابوبکرؓ سے شروع ہوا اور حضرت عثمانؓ کے دور میں مکمل ہوا۔

تدوین حدیث:۔

روایت اور درایت کے اصولوں کو حضورؐ کے ایک صدی بعد جمع ہونے والی احادیث میں سب سے زیادہ استعمال کیا گیا۔اس میں اصول جرح و تعدیل سے کام لیا گیا اور ذیلی اور ضمنی طور پر علم اسماء الرجال پیدا ہوا اور ہر راوی کے احوال تلاش کر کے اُن کا تجزیہ کیا گیا۔

تدوین فقہ:۔

فقہ کی تدوین بھی اصول تحقیق کے استعمال سے انجام پائی۔ یہاں مسلمات، قرآن، حدیث، سنت کے بعد قیاس یعنی استخراجی اور استقرائی استدلال اور بصیرت و اجتہاد کو بنیاد بنایا گیا۔اجماع یعنی علماء کے اتفاق رائے کو بھی ایک اصول قرار دیا گیا۔اجتہاد کے لئے 'نفس' کی اصطلاح دراصل بصیرت کے مفہوم میں ہے۔یعنی قرآن و سنت کے ادراک سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے اسے نفس قرار دیا گیا۔اور اسکی روشنی میں اجتہاد کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔

روزمرہ اُمور کو دین اور فقہ کی روشنی میں پرکھنے کے لئے درایت کے اصول کو برتا جاتا ہے۔

سیرت اور تاریخ نگاری:۔

سیرت نگاری اور تاریخ نگاری تدوین قرآن وحدیث کے بعد مسلمانوں کا بڑا کارنامہ ہے، سیرت رسولؐ لکھنے سے اس کا آغاز ہوا تاریخ اسلام اور تاریخ عالم لکھنے تک وسیع ہوتا گیا۔ سیرت نگاری اور حدیث کی تدوین میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سیرت کی کتابوں میں حضورؐ کی ذات گرامی پر بحث کی جاتی ہے اور حدیث میں آپ کے اقوال زیر بحث آتے ہیں۔ چنانچہ سیرت نگاری میں روایت کے اصولوں کو اہمیت دی گئی اسلام میں فن تاریخ نگاری ابتداء میں اصول حدیث کے مطابق ہوتی کیونکہ محدثین ہی مورخین ہوا کرتے تھے، بعد میں جب کوئی مصنف تاریخ لکھتا تو اسناد کا حوالہ دینا ترک کر دیتا تھا۔

ان تحقیقی اصولوں میں قابل اعتماد روایات، تحریری مواد اور قرآنی شہادتوں کے درمیان توازن رکھنے کی کوششوں میں لوگوں کے عقائد و مزاج کو بھی دخل تھا۔ اسطرح تاریخی نقطہ نظر بدلنے لگے۔ ابن خلدون نے علم تاریخ نویسی کا آغاز کیا۔ اُس نے تقابلی مطالعے کا اصول اپنے مقدمے میں بیان کیا۔ اسلامی روایت میں تحقیقی اصول وضع کرنے میں اہم نام حاکم نیشاپوری کا ہے۔ اُنھوں نے جرح و تعدیل کے ساتھ ساتھ صحیح و سقم کی پہچان، احادیث سے اخذ نکات، ناسخ و منسوخ، غریب الفاظ، غریب متن، غریب السنہ کی تحقیق، متناقص اور متعارض روایت، زوائد کی پہچان، ملتے جلتے ناموں کی پہچان، جیسے کئی اصول بتائے۔ اس کے بعد ابن ندیم بنیادی اور ثانوی ماخذوں کا تقابل، نارسائی کا اعتراف، خطا اور تحریف کے امکان، جعل سازی، صاف گوئی وغیرہ کے اصولوں کو سامنے لایا۔ اسلامی علوم میں تاریخ نگاری کا فن سیرت نگاری کی بدولت پیدا ہوا اور سیرت کا فن حدیث کا مرہون منت ہے۔ ان میں خبر مع سند کا طریقہ رائج ہوا۔ جسکا درجہ حدیث میں سب سے زیادہ ہے، سیرت میں قدرے کم اور تاریخ نگاری میں سب سے کم رہا۔ تاہم

آج بھی تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے 'سند' کا تجزیہ کرنا بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ تحقیق میں ابن ندیم کی الفہرست کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔یعنی دوران مباحث سوال اُٹھائے جانا اور ان کا حل تلاش کرنا یا دوسرے لفظوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہدف بنا کر ایسی معلومات اور کوائف کو زیادہ نتیجہ خیز بنانا ابن ندیم کا طریقہ ہے۔وہ تاریخیت کا لحاظ کرتا ہے۔متعدد مباحث میں تمام قابل تنقیح مواد کا احاطہ کرتا ہے۔مصنف کی لکھی ہوئی تحریر سے اسناد کرتا ہے۔اپنی دیکھی ہوئی دستاویزات کی صراحت کرتا ہے اور نتائج اخذ کرتا جاتا ہے۔وہ بنیادی ماخذ کی اہمیت سے واقف ہے۔تقابل اور تحقیق متن کی طرف پوری طرح متوجہ ہے وہ اجرائے حکم میں جلد بازی کی مذمت کرتا ہے اور نقل قول میں احتیاط کا قائل ہے۔

ابن خلدون تقابلی جائزہ کا قائل ہے کہ متعدد ماخذوں سے حقائق کی جانچ ضروری ہے۔وہ سماجی تاریخ کا بہت اچھا شارع ہے اور وہ محض نقل کو تحقیق کے لئے زہر سمجھتا ہے۔

اسلامی تحقیق و تصنیفات:۔

تدوین قرآن کے تقریباً سو (۱۰۰) برس بعد علوم اسلامی میں تحقیق کی ابتداء احادیث کو پرکھنے سے ہوئی۔ صحابہؓ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس اور حلقے قائم ہوئے مگر یہ سب کچھ زبانی تھا۔پھر بنو امیہ سے حکما علما سے تصنیفیں لکھوائیں، جیسے عبدالمالک نے قرآن کی تفسیریں لکھوائیں۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔انھوں نے تمام ممالک اسلامی میں حکم بھیجا کہ احادیث نبویؐ مدون و قلمبند کی جائیں۔سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث تھے اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، اُن سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے اور تمام ممالک کو بھیجے گئے۔ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حرم النصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، اُنکو بھی خاص

طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔ حضرت عائشہؓ اور اُنکی زیر تربیت رہنے والی عمرۃ بن عبدالرحمٰن کی مرویات کو عمر بن عبدالعزیز نے خاص اہمیت دی۔

اُنھوں نے مغازی اور سیر پر بھی توجہ دی۔ اور غزوات نبویؐ، اور سیرت پر کتابیں لکھوائیں گئیں۔ اسی زمانے میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی اور جیسا کہ امام سہیلی نے روفن الدائف میں تشریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی۔ امام زہری اُس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں اُن کا کوئی ہمسر نہ تھا، وہ امام بخاریؒ کے شیخ الشیوخ تھے۔ اُنہوں نے حدیث و روایت کے حاصل کرنے میں اتنی محنت کی کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد، جو مل جاتا اُن سے حضرتؐ کے اقوال و حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے۔

امام زہری قریشی تھے، وہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور بہت سے صحابہؓ کو اُنہوں نے دیکھا تھا۔ ۸۰ھ میں عبدالمالک بن مروان کے دربار میں گئے۔ اُس نے بہت قدر و منزلت کی۔ اُنہوں نے کتاب المغازی اُس کی ہدایت پر لکھی۔ امام زہری کے باعث مغازی اور سیرت کا عام مذاق پیدا ہوگیا۔ اُن کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ اُن میں یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح تمارؒ، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہیں صاحب المغازی کہا جاتا تھا۔

امام زہری کے تلامذہ میں دو اشخاص نے اس فن میں شہرت حاصل کی۔ موسیٰ ابن عقبہ اور محمد بن اسحاق۔ اس سے پہلے مصنفین مرتبین معروضی طریق تحقیق سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان کی بدولت اسلامی تحقیق میں یہ تبدیلیاں آئیں۔ [9]

ا۔ مرتبین و مصنفین اب تک روایات کی صحت کا التزام نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے زیادہ تر اسکا التزام کیا

۲۔کثرت سے واقعات نقل کیے جاتے جس کے باعث ہر قسم کی رطب ویابس روائتیں آجاتیں۔اب وہ روائتیں ہی لی جاتیں جو اُن کے نزدیک صحیح ثابت ہوتیں۔

۳۔چونکہ روایت کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی ۔اس لئے لوگ چھوٹی عمر میں روائتیں کرتے جس وقت واقعات کا صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔اس لئے اکثر روائیتوں میں اختلاط وتغیر پیدا ہو جاتا تھا۔اب موسیٰ بن عقبہ نے تحقیق کا کام کبیر سنی میں کیا اور اس کی روایت ڈالی کہ باشعور ہونے کے بعد تحقیق کے کام کی ذمہ داری لی جائے۔

محمد بن اسحاق نے فنِ مغازی میں سب سے زیادہ شہرت پائی ۔ وہ تابعی تھے اور ایک صحابی (حضرت اُنسؓ) کو دیکھا تھا۔علم حدیث میں کمال حاصل تھا۔اُن کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے پر محدثین میں اختلاف ہے۔ ابن حبان کے مطابق محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض یہ تھا کہ اُنہوں نے جنگِ خیبر اور دیگر غزوات کے واقعات اُن یہودیوں سے سنے جو مسلمان ہو گئے تھے اور چونکہ یہ واقعات اُنہوں نے یہودیوں سے سنے تھے اس لئے ان پر یقین نہیں کیا جاسکتا یا کم از کم اعتماد کے قابل نہیں ۔محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی، کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا۔اسی کتاب کو ابن ہشام نے منقح واضافہ سے مرتب کیا۔ابولنصر فتح بن موسیٰ خضراوی (۲۶۳ھ) وعبدالعزیز بن احمد المعروف (سعد ویزی (۶۰۷ھ) ابواسحاق النصاری وفتح الدین ابراہیم المعروف) بہ ابن الشہید التونی (۲۹۳ھ) نے اس کتاب کو منظوم کیا۔

واقدی کے تلازمۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت محمدؐ اور صحابہؓ کے حالات پر مبنی اتنی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ اُسکا جواب آج تک نہیں ہو سکا۔ابن سعد مشہور محدث ہیں ۔ بلاذری مشہور مورخ، اُن کے شاگرد تھے ۔ابن سعد کی کتاب کا نام ''طبقات'' ہے۔اُسکی بارہ جلدیں ہیں ۔دو جلدوں میں حضرت محمدؐ کی زندگی کے حالات اور باقی جلدوں میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے حالات ہیں ۔اُن کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی۔کتاب میں تمام روائتیں بہ سند

مذکور ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی کتابیں لکھی گئیں مگر نام کے علاوہ اس سلسلے میں اور کوئی معلومات نہیں۔ ان کتابوں کے نام کشف الظنون میں ملتے ہیں۔ مگر اُن کا کوئی وجود نہیں۔

سیرت کے سلسلے میں تاریخی تصنیفات بھی ہیں۔ اُن میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں یعنی جن میں روائتیں بہ سند مذکور ہیں، اُن سے سب سے مقدم اور قابل استناد امام بخاریؒ کی دونوں تاریخ ہیں۔ لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں۔ اور اُن میں سوانح نبویؐ بہت کم اور جستہ جستہ واقعات بلاترتیب ہیں۔ تاریخی سلسلے میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، امام طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین اُن کے فضل کمال، وثوق اور وسعتِ علم کے معترف ہیں۔ اُن کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، تمام مستند اور مفصل تاریخیں، مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، تاریخ ابنؒ خلدون ار ابوالفدا وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں۔

یہ قدماء کی تصنیفات تھیں۔ بعد ازاں اُنکی شرحیں لکھی گئیں جیسے روض الانف سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ سیرت دمیاطی، سیرت خلاطی، سیرت گازونی، سیرت ابن ابی طے، سیرت مغلطائی، سیرت المصطفیٰ، شرف المصطفیٰ، اکتفا، سیرت ابن عبدالبر عیون الاثر، نور ابزاس، سیرت منظوم، مذاہب لدنیہ زرقاعلی المواہب، سیرت جلسی لکھی گئیں۔[۱۰]

اسلامی تحقیق اور مستشرقین:۔

اسلامی علوم میں مروج تحقیقی اصولوں کے جانچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فن روایت اور درایت کی نگاہ کسی قدر بلند ہے۔ علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت، کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی کی ہے۔ کیا اس اہتمام واعتناء کا دنیا کی دوسرے اقوام کے سرمایہ تاریخ و روایت میں اسلام کے بارے میں معبود ہے۔

کیا یورپی سیرت نگاروں نے پیغمبر اسلام کے بارے میں اتنی جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ تحقیق کی ہے۔قرون وسطیٰ میں یہی حال رہا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں مستشرقین یورپ کا وجود عمل میں آیا۔نادرالوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں اور سنے سنانے عامیانہ خیالات کے بجائے تاریخ اسلام وسیرت محمدؐ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی۔عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے دارالعلوم قائم ہوئے اور عربی پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔اسطرح اُنیسویں صدی تک جو کتابیں ترجمہ ہوئیں اُن میں تاریخ الفداء، **مشکوۃ المصابیح**، **المغازی**، سیرت الرسولؐ (ابن ہشام)، تاریخ مدینہ (سمہودی)، **تاریخ معارف (ابن قتیبہ) مروج المذاہب (مسعودی) واقدی کی محمد بہ مدینہ، یعقوبی کی تاریخ، طبری کی تاریخ، ابن سعد کی طبقات** کے تراجم شامل ہیں۔

ان کتابوں کے تراجم کی اشاعت سے مذہبی منافرت میں کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش کو جنم دیا۔

اس کے باوجود جب مستشرقین اسلامی تاریخ لکھتے ہیں تو اُس میں سے تعصب جھلکتا ہے۔کیونکہ ایک تو اُن کی پہنچ حدیث کی کتابوں تک نہیں رہی۔دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تفحص شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔یورپ اس بات کی بالکل پروہ نہیں کرتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب۔اس کے اخلاق وعادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے۔اس کے نزدیک یہ تحقیق وتدقیق نہ ممکن ہے اور نہ ضروری ہے۔وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، فرض کریں کہ ایک عام شخص ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے اور بیان بالکل مسلسل ہے تو مستشرقین کے مواقف اسکو تسلیم کرلیا جائے گا۔بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اسکی پرواہ نہیں کرتے کہ روایت کی حالت کیا ہے بلکہ وہ پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اسمائے رجال کے دفتر میں اُس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں

درج۔ہے یا نہیں۔اگر نہیں ہے تو اُس کے نزدیک اسکا بیان بالکل نا قابل اعتناء ہے لیکن اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرآن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو تو اسکی روایت قبول کر لی جائے گی۔[11]

شبلی نعمانی کی سیرت نگاری:۔

شبلی نعمانی کا سیرت نگاری میں ایک اہم مقام ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے سیرت نگاروں میں اُن کا کوئی ہم سر نہیں۔انہوں نے سیرت نگاری کے جن اصولوں پر عمل کیا انہیں اسطرح بیان کیا ہے۔

ا۔سب سے پہلے سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا ہے۔یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن شریف میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

۲۔قرآن مجید کے بعد احادیث کا درجہ ہے۔چنانچہ انہوں نے احادیث صحیح کے سامنے سیرت کی روائتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاریؒ و مسلمؒ وغیرہ میں مذکور ہیں۔اُن کے مقابلے میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں۔چنانچہ انہوں نے تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روائتیں لی ہیں۔

۳۔روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام، اور طبری کی عام روائتیں کافی خیال کی گئی ہیں۔ لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں اُن کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کد و کاش کی گئی ہے۔ اس کے لئے ابن ہشام، ابن سعد، اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ کر لیئے اور اسماالرجال کی کتابوں سے اُن کی جرح وتصدیل کا نقشہ بنایا تا کہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی ہو جائے۔

۴۔پہلی فروگذاشتوں کے اصلاح اور تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یعنی ناواقف مستشرقین نے جو

اغلاط کیں انکو دلیل سے رد کیا ہے۔[۱۲] چنانچہ مسلم محققین نے درایت کے اصول کو اپناتے ہوئے، ہمیشہ تحقیق میں اعلیٰ معیار کو قائم رکھا ہے اور یہی اصول سائنسی اور معروضی تحقیق کے لئے آج بھی ضروری ہے۔

خلاصہ:۔

مسلمان اور تحقیق:۔

مسلمانوں میں تحقیق وتنقید کا شعور خود قرآن کریم نے پیدا کیا، قرآن کریم حقیقت کی تلاش وجستجو کا حکم دیتا ہے۔تحقیق اسی کا نام ہے۔قرآن تفکر، تدبر، یا تفقہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اسلام کو بنیادی طور پر مبنی بہ تحقیق مذہب ثابت کرتے ہیں۔اسلام میں کسی امر کو جاننے کیلئے تحقیق کا حکم ہے۔ پہلا اسلامی اصولِ تحقیق روایت اور پرکھ کا ہے۔ دوسرا اصولِ تحقیق درایت یا عقلی پرکھ اور بصیرت کا استعمال کا ہے۔مسلمانوں کی سماجی تاریخ میں تدوین قرآن، تدوین حدیث، سیرت نگاری اور تاریخ نگاری میں تحقیق سے کام لیا گیا۔تقابل، جرح اور تعدیل مع سند دوسرے تحقیقی طریقے تھے جن سے مسلمانوں نے کام لیا۔تحقیقی سند کے لحاظ سے سب سے بلند درجہ تدوین قرآن پھر حدیث، پھر سیرت اور پھر تاریخ نگاری کا ہے مسلمانوں کا سائنسی طریقہ، معلومات کو معروضی طور پر مشاہدات تجربات پر پرکھنا تھا۔ابن ندیم کی کتاب الفہرست، ابن خلدون کا مقدمہ، شبلی نعمانی کی سیرت النبیؐ، مسلمانوں کی تحقیقی کاوشوں کی چند مثالیں ہیں مسلمانوں میں سائنسی طریقہ کا آغاز الکندی سے ہوا اور جابر بن حیان سے ہوتا ہوا اور اسکی تکمیل ابن سینا، البغدادی، الرازی اور البیرونی نے کی۔اسلام نے تحقیق کے معروضی ہونے کے لئے عدل کی شرط رکھی ہے۔اور اسلامی اور جدید اصول تحقیق کا پہلا مرحلہ بعض نکات کو مسلمات قرار دیتا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں ندوۃ العلماء، اور دار المصنفین نے اسلامی علوم کی تحقیق میں نمایاں حصہ لیا۔پنجاب یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد چند ادارے ہیں جہاں اسلامی علوم پر تحقیق ہو رہی ہے۔لیکن مسلمانوں کی دور زریں والی محققانہ روح کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی

رہے گی۔

سائنٹفک اور معروضی تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ سنی سنائی روایات اور ذرائع کو ماخذ نہ بنایا جائے بلکہ سائنٹیفک اور معروضی طریق تحقیق کو اپنایا جائے، یعنی رعایت کے بجائے درایت کے اصول کو اپنایا جائے۔ جب کوئی محقق تحقیق کا کام اپنے ذمے لےتو نہایت ذمہ داری سے اپنا فرض ادا کرے، بغیر کوئی ذاتی پسند اور ناپسند کے، بغیر کسی تعصب کے اسے اپنا یہ فرض ادا کرنا چاہئے۔ جن ذرائع یا ماخذ کو وہ استعمال کرے انہیں جانچ لے کہ آیا جو حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ کہاں سے لئے گئے ہیں۔ وہ کسی کا آنکھوں دیکھا حال ہے، یا جس ذریعہ سے حاصل کئے گئے ہیں اُس نے وہ بات خود دیکھی یا مشاہدہ کیا ہے۔ اگر اُس کے درمیان کوئی راوی موجود ہےتو کیا وہ شخص قابل اعتبار ہے، اُس کا کردار کیسا ہے۔ کیا وہ جھوٹا، لاپرواہ یا بھول بھلکڑ تو نہیں۔ فرض کریں اگر کوئی سیاسی شخصیت یہ کہتی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے اُس کے سامنے یہ بات کہی تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ شخص کون ہے، کیسے کردار کا مالک ہے اور قائداعظم کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے تھے۔ کیا وہ اُن کا ایک مخلص کارکن رہا ہے، وغیرہ۔ چنانچہ محقق کو تحقیق کرتے ہوئے محض روایت کے بجائے درایت وعدل کے اصول پر کاربند رہنا چاہئے اور ہر بات کی چھان پھٹک کے لئے اپنی بصیرت پر بھروسہ کرکے اُسے استعمال میں لانا چاہیے اور سند اور صداقت کے پیمانے پر تول کر قبول کرنا چاہئے۔ تحقیق کے کام میں کوائف کو جانچنے کا یہ طریقہ اصولِ درایت کہلاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، مولانا راغب رحمانی دہلوی (مترجم)، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۰ء، ص ص ۱۷۳۔۱۷۴۔

۲۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، حصہ اوّل، کراچی، محمد سعید اینڈ سنز، ت۔ن، ص ص ۳۷۔۴۱، ۶۶۔۶۷۔

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۹۵ء، ص ۵۹۔

۴۔ محمد باقر خان خاکوانی، *فقہاء کے نزدیک خبرواحد*: *اسلام اور عصر جدید*، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ء۔

۵۔ شبلی نعمانی، بحوالہ سابقہ، ص ص ۴۳۔۴۴۔

۶۔ *ایضاً*، ص ص ۴۴۔۴۵۔

۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، بحوالہ سابقہ، ص ۵۰۔

۸۔ محمد بن اسحاق، ابن ندیم وراق، *الفہرست*، مولانا محمد اسحاق بھٹی (مترجم)، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۹، ص ۶۴۔

۹۔ شبلی نعمانی، بحوالہ سابقہ، ص ص ۲۲۔۲۳۔

۱۰۔ *ایضاً*، ص ص ۱۸۔۳۷۔

۱۱۔ *ایضاً*، ص ص ۸۵۔۱۰۰۔

۱۲۔ *ایضاً*، ص ص ۱۰۰۔۱۰۱۔